انتظار حسین کا افسانہ ’’کنکری‘‘: افق ہائے معانی سے قاریانہ مکالمہ

Unfolding the Horizons of Meaning: Reader-Response of Intizar Hussain's Story "Kankari"

ڈاکٹر محمد راشد سعیدی [i]

Abstract:

Intizar Hussain is regarded as one of the most significant and celebrated short story writers in Urdu literature, known for his rich symbolism, layered narratives, and the intricate interplay of ambiguity and multiplicity of meanings. His short story Kankari stands as a profound literary text that invites readers into a deeply interpretive space. Interpreting such a text necessitates a critical framework capable of accommodating its semantic complexities. Reader-Response Criticism offers a powerful paradigm in this regard, foregrounding the role of the reader in the construction and activation of meaning. This research paper applies reader-oriented theory to "Kankari", analysing it through various reading perspectives, including the aesthetic, philosophical, psychological, postcolonial, scientific rationalist, and intertextual readers. The study demonstrates that Kankari is not a confined narrative but an expansive interpretive field, where meaning emerges through the reader's expectations, positionality, and intellectual engagement. Through this multi-perspectival analysis, the paper underscores the richness of the text and the indispensability of reader-based critical paradigms in exploring its depths.

Keywords: *Intizar Hussain, Reader-Response Criticism, Ambiguity, Multiplicity of Meaning, Urdu Fiction, Interpretation.*

انتظار حسین اردو کے ممتاز افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں، جن کی تحریریں علامتی اسلوب، تہ دار بیانیہ، اور ابہام و کثرتِ معنی کے حامل متون کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ان کا افسانہ کنکری ایک ایسا جمالیاتی و فکری فن پارہ ہے، جو اپنے قاری کو مختلف جہات سے مخاطب کرتا ہے۔ اس افسانے کی تعبیر کسی ایسے تنقیدی فریم ورک کی متقاضی ہے جو متن کے باطن میں پوشیدہ معانی کو متنوع قراءتی تناظرات سے ابھار سکے۔ قاری اساس تنقید ایسا ہی ایک مؤثر نظریہ ہے، جو متن اور قاری کے درمیان تفاعل کو مرکزِ توجہ بناتے ہوئے معانی کی تشکیل کو ایک فعال اور فکری عمل قرار دیتا ہے۔ اس تحقیقی مضمون میں کنکری کا تجزیہ قاری اساس تنقید کے مختلف زاویوں سے کیا گیا ہے، جن میں جمالیاتی قاری، فلسفی قاری، نفسیاتی قاری، سیاسی و نوآبادیاتی قاری، سائنسی عقلی قاری اور بین المتنی قاری شامل ہیں۔ اس تجزیے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کنکری محض ایک مختصر کہانی نہیں بلکہ ایک ایسا علامتی و فکری کینوس ہے، جو ہر قاری کو اس کی توقعات، ذہنی سانچوں اور فکری پس منظر کے مطابق مختلف معانی عطا کرتا ہے۔

کلیدی الفاظ: انتظار حسین، افسانہ، ، قاری اساس تنقید، ابہام، کثرتِ معنی، تعبیر۔

اردو افسانہ نگاری میں انتظار حسین کا(۱۹۲۳ء-۲۰۱۶ء) مقام ایک ایسے اساطیری اور استعاراتی بیانیہ ساز کے طور پر سامنے آتا ہے، جس نے تاریخ، تہذیب، ثقافت، اساطیر اور روایت کے ملبے سے ایسے نئے متنی پیکر تراشے جو اپنے باطن میں جمالیاتی تہ داری، معنوی پیچیدگی، اور وجودی بازگشت رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں افسانوی متن نہ صرف سطحی بیانیہ پیش کرتا ہے بلکہ ایک ایسا ’’زیرِ متن‘‘ بھی فراہم کرتا ہے جو مسلسل قاری کی توجہ، تعبیر اور تخلیقی شرکت کا متقاضی ہے۔ یہ وہی تخلیقی بصیرت ہے جس کے باعث ان کے افسانے

[i] لیکچرر، شعبہ اردو و اقبالیات، دی اسلامیہ یونی ورسٹی آف بہاول پور (Corresponding Author)

محض نثری بیانیہ نہیں رہتے بلکہ فلسفیانہ تفکر اور وجودی کرب کی گہری پرتیں کھولتے ہیں۔ان کے افسانے محض ایک کہانی نہیں سناتے بلکہ وہ انسانی شعور کی گہرائیوں،اجتماعی لاشعور اور تہذیبی بحران کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے فکشن میں ہجرت، ماضی کی بازیافت، تہذیبی شناخت کا بحران اور عصری مسائل جیسے موضوعات کو علامتی ڈھانچے میں پیش کیا گیا ہے،جس سے مکالمہ کرنے لیے قاری کی فعال شرکت ناگزیر ہو جاتی ہے۔یہ کثیر المعنویت اور تہ داری ہی ہے جو انتظار حسین کے متون کی باز قرأت اور مختلف تناظرات میں تجزیے کا تقاضا کرتی ہے تاکہ ان کے معنیاتی نظام سے انصاف کیا جا سکے۔انتظار حسین کی نثر میں ابہام ایک بنیادی جمالیاتی اصول ہے، جیساکہ نارتھروپ فرائے(Northrop Frye)کے الفاظ میں ambiguity is not confusion, it is the multiplicity of resonances[1]۔انتظار حسین کی کہانیوں کو محض اسلوبی یا روایت پرستانہ عینک سے دیکھنا ان کی معنوی کثرت کے ساتھ ناانصافی ہو گی۔ان کے افسانے متن کے سطحی واقعے سے زیادہ اس کے غیر مرئی تناظر میں جینے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کی کہانیوں کی گہرائی تک پہنچنے کے لیے قاری کو صرف منطقی یا جمالیاتی بصیرت نہیں،بلکہ ایک تہذیبی حافظے اور متنوع تعبیر کی صلاحیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ انتظار حسین کے افسانوی بیانیے کو قاری کی شرکت کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جا سکتا۔

انتظار حسین کے افسانوں پر ہونے والے تجزیات ایک ہی پہلو تک محدود نہیں رہ سکتے بلکہ انھیں وسیع نظریاتی فریم ورکس یا تناظرات (جیسے مابعد نوآبادیات اور قاری اساس تنقید) کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہماری اس تحریر کا مرکزی نقطہ،انتظار حسین کا افسانہ "کنکری" ہے،جس نے بحیثیت افسانوی مجموعہ تو بہت شہرت حاصل کی، لیکن بحیثیت افسانہ نظر انداز بھی ہوا،حالاں کہ یہ ان کے اسلوب اور فکری وسعت کی ایک نمایاں مثال ہے۔ یہ افسانہ اپنے علامتی برتاؤ، نفسیاتی گہرائی اور وجودی تھیمز کی وجہ سے ایک پیچیدہ اور کثیر المعنی متن ہے۔ "کنکری" میں کردار کا خود کو "گھلتی ہوئی کنکری" محسوس کرنا اور "منحوس" جبلتوں کے سامنے بے بس ہو جانا،انسانی وجود کے زوال، فنا اور بے مقصدیت کی ایک گہری علامت ہے۔یہ افسانہ محض ایک پلاٹ نہیں بلکہ لازوال انسانی کرب اور شناخت کے بحران کی عکاسی ہے،جس میں حقیقت اور وہم کی

سرحدیں دھندلا جاتی ہیں۔اس کی یہی پیچیدگی، تہہ داری اور بوقلمونی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اس کے تجزیہ و تعبیر کے لیے ایک تناظر کے تحت کرنے کی بجائے کسی ایسے تنقیدی فریم ورک کا انتخاب کیا جائے، جس سے افسانے کے بیشتر معانی سے مکالمہ ہوسکے۔ معاصر تنقیدی تناظرات میں کسی نظریہ نقد کے پاس اس نوع کا فریم ورک ہے تو وہ قاری اساس تنقید ہے۔ یہ دراصل ایک ایسی تنقیدی روِش ہے جس میں یہ بتانے کی صلاحیت موجود ہے کہ کوئی متن کس طرح مختلف قارئین پر متنوع انداز میں اثر انداز ہوتا ہے اور ان کے ذہن میں کیا نئی تعبیرات پیدا کرتا ہے۔ ''کنکری'' کا قاری اساس ہمہ جہت تجزیاتی مطالعہ نہ صرف انتظار حسین کے فن کی مزید پرتوں کو وا کرے گا بلکہ اردو افسانے میں قاری کی فعال حیثیت اور متن کی کثیر المعنویت کو بھی اجاگر کرے گا۔

ادبی تنقید کے ارتقائی سفر میں قاری اساس تنقید (Reader-Response Criticism) ایک نمایاں موڑ کی حیثیت رکھتی ہے، جس نے ادبی متن کی تفہیم و تعبیر میں قاری کے کردار کو مرکزی حیثیت دی۔ یہ نقطہ نظر اس بنیادی تصور پر قائم ہے کہ ادبی متن کا معنی محض مصنف کے ارادوں یا متن کے اندرونی ڈھانچے سے نہیں بلکہ قاری کے ساتھ مکالمے کے عمل میں تشکیل پاتا ہے۔ یہ ادبی تنقید کا وہ دبستان ہے جو متن کو جامد اور اکہرے مفہوم کی حامل شے سمجھنے کے بجائے اسے ایک ایسی کشادہ اور متحرک تشکیل قرار دیتا ہے جس کی معنویت قاری کے تعامل، تجربے اور تفہیمی سطح سے وابستہ ہوتی ہے۔ اس تنقیدی رجحان کی غایت صرف یہ نہیں کہ قاری کو مرکزیت دی جائے، بلکہ یہ ہے کہ تنقیدی مکالمہ متحرک ہو، تخلیقی ہو اور سیاقی بصیرت سے بھرپور ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قاری اساس تنقید معنی کی موضوعیت (Subjectivity of Meaning) اور کثرتِ تعبیر (Multiplicity of Interpretations) پر زور دیتی ہے۔ اس کے نزدیک ایک متن کا کوئی ''حتمی'' یا ''واحد'' معنی نہیں ہوتا بلکہ ہر قاری اپنے سیاق اور تناظر کے مطابق اس سے مختلف معانی اخذ کرسکتا ہے۔ اس کی یہی وسعت اور لچک اسے جدید ادبی تجزیے کے لیے ایک ناگزیر آلہ بناتی ہے، اسٹینلی فِش (Stanley Fish) کے بقول:

> Meanings are not extracted but made, and the making is an event, a process which has the reader at its center.[2]

اسی بات کو مغربی قاری اساس نقادوں کے ساتھ ساتھ مشرقی شعریات کے بعض پہلو بھی متوازن انداز میں پیش کرتے ہیں، مثلاً ہندوستانی جمالیات میں 'رس' کی تخلیق قاری کے باطنی تجربے سے منسلک ہے، جو کسی ایک مفہوم کا پابند نہیں بلکہ وجدان، کیفیت اور تجربے کا نچوڑ ہے۔

قاری اساس تجزیہ چند اہم عوامل پر مبنی ہوتا ہے، جو متن اور قاری کے درمیان پیچیدہ تعلق کو واضح کرتے ہیں۔ ان میں قاری کا فعال کردار، توقعات کا افق (Horizon of Expectations) اور زاویۂ قرأت (Reading Position) کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ قاری محض ایک غیر فعال وصول کنندہ نہیں ہوتا بلکہ وہ متن کے ساتھ فعال تعامل کے ذریعے معنی کی تشکیل میں حصہ لیتا ہے۔ ہینس رابرٹ جاس (Hans Robert Jauss) نے اپنے نظریے "توقعات کا افق" کے ذریعے یہ واضح کیا کہ ہر قاری اپنے ثقافتی، سماجی، تاریخی اور فکری پس منظر کے ساتھ کسی بھی متن کو پڑھتا ہے، اور یہی پس منظر اس کی توقعات کا افق بناتا ہے۔ توقعات کا افق ایک ایسا تنقیدی تصور ہے جو یہ واضح کرتا ہے کہ ہر قاری اپنے ثقافتی، سماجی، تاریخی اور فکری پس منظر کے ساتھ کسی بھی متن کو پڑھتا ہے۔ اسی طرح "زاویۂ قرات" سے مراد وہ مخصوص نظریاتی یا عملی نقطہ نظر ہے جس سے قاری متن کا مطالعہ کرتا ہے۔ یہ قاری کی اپنی شخصیت، تجربات اور اس کے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوتا ہے اور نتیجتاً ایک ہی متن مختلف قارئین کے لیے مختلف معانی پیدا کرتا ہے۔ سٹینلی فش (Stanley Fish) نے "تفسیری گروہوں" (Interpretive Communities) کا تصور پیش کیا، جس کے مطابق قارئین مخصوص کمیونٹیز کا حصہ ہوتے ہیں جو متن کی تعبیر کے لیے مشترکہ اصول اور قواعد کا اشتراک کرتے ہیں۔ یہ قاری کے انفرادی تجربے کو ایک اجتماعی سیاق میں رکھتے ہوئے معنی کی کثیر المعنویت کو مزید تقویت دیتا ہے۔

قاری اساس تجزیہ کی سب سے بڑی طاقت اس کی وہ صلاحیت ہے کہ یہ دیگر تنقیدی سیاقات اور تناظرات کو اپنے اندر سمو سکتا ہے۔ یہ صرف ادبی متن کے نفسیاتی یا سماجیاتی پہلوؤں پر ہی روشنی نہیں ڈالتا بلکہ تاریخی، ثقافتی، مابعد نوآبادیاتی، پسِ ساختیاتی تانیثی، مارکسی اور وجودی وغیرہ جیسے نظریاتی فریم ورکس کو بھی ادبی تجزیے میں لاگو کرنے کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے۔ ہر نظریہ قاری کو ایک مخصوص

"زاویہ قرات" فراہم کرتا ہے جس سے وہ متن کو پرکھتا ہے، اور اس طرح مختلف علمی و فکری دھاروں کے تحت متن کے نئے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ وولف گانگ اِیسر (Wolfgang Iser) کے مطابق:

> A literary text is not an object that stands by itself and that offers the same view to each reader in each reading. Rather, it represents a set of instructions for the production of meaning.[3]

اس طرح دیکھیں تو متن کو مفہوم کی کوئی تیار شدہ عمارت نہیں بلکہ ایک تخلیقی منصوبہ سمجھا جاتا ہے، جسے قاری اپنی ذہنی، جذباتی اور تجرباتی شرکت سے مکمل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری اساس تجزیہ محض کسی قاری کی ذاتی پسند یا فہم کا بیانیہ نہیں، بلکہ ایک مربوط تنقیدی عمل ہے جس میں قاری کی شناخت، ثقافتی پس منظر، تاریخی معروضات، صنفی مقام، اور ذہنی تشکیل جیسے عناصر دخیل ہوتے ہیں۔

قاری اساس تنقید کی غائت محض متن کے معانی کی کثرت کو تسلیم کرنا نہیں بلکہ اس بات پر زور دینا ہے کہ متن ایک متحرک اور زندہ حقیقت ہے جو ہر نئی قرأت کے ساتھ نئے معنیاتی امکانات کو جنم دیتا ہے۔ یہ متن کی لامحدود معنوی گہرائی اور قاری کے تخلیقی کردار کو تسلیم کرتا ہے۔ ولف گینگ آئزر (Wolfgang Iser)کے مطابق قرأت کا عمل "خالی جگہوں" (Gaps) کو پر کرنے پر مشتمل ہوتا ہے جو متن قاری کے لیے چھوڑ دیتا ہے، اور قاری ان خالی جگہوں کو اپنے تخیل اور تجربے سے پر کرکے معنی کی تشکیل کرتا ہے۔

انتظار حسین جیسے رمز نگار اور اساطیری افق سے رنگارنگ مناظر دکھانے والے افسانہ نگار کی تحریریں محض متن نہیں بلکہ تعبیر کی گنجائش سے لبریز ایسے ادبی پیکر ہیں جنھیں قاری کی بصیرت ہی مکمل کرتی ہے۔ قاری اساس تنقید کی غایت دراصل یہی ہے کہ تنقید کو مفعول سے فاعل میں بدلا جائے، اور تفہیم کو کسی "حتمی معنی" کے بجائے ایک "تعبیری تجربہ" میں تبدیل کر دیا جائے، جو ہر قرأت میں نیا ظہور اختیار کرے۔ ذیل میں قاری اساس تنقیدی تحدید کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جمالیاتی، نفسیاتی، مابعد طبیعیاتی اور مابعد نوآبادیاتی زاویہ ہائے قرأت سے مذکورہ افسانے کی تفہیم کی کوشش کی جائے گی۔ اگرچہ تناظرات ہمہ قسم کے ہو سکتے ہیں تاہم یہ وہ امکانی تناظرات یا زاویے ہیں، جن کے اطلاق پر "کنکری" کا متن داخلی تحرک

اور ردّ عمل کا اظہار کرتا ہے اور قاری کو تاثر فراہم کرتا ہے۔

پہلے پہل افسانے کو ایک اکادمیانہ مزاج ادبی و جمالیاتی قاری کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، جس کے پیشِ نظر افسانے کا پلاٹ، کردار، اسلوب، تکنیک اور برتاؤ ہوتا ہے۔ دورانِ قرأت اس کا سابقہ گہرے معانی اور معانیاتی نظام سے ہوتا تو ہے لیکن وہ اس سے سرسری گزر جاتا ہے، تاہم ادبی جمالیات کے پہلو اسے ضرور متاثر کرتے ہیں۔ ایسے ادبی و جمالیاتی قاری کے نزدیک انتظار حسین کا افسانہ "کنکری" اردو کے ان منفرد اور گہرے فن پاروں میں سے ایک ہے جو اپنی جمالیاتی ساخت، اسلوب کی ندرت اور تکنیکی چابک دستی کے باعث قاری کو ایک خاص فکری اور حسی تجربہ عطا کرتا ہے۔ ایک ایسا قاری جو ادب کو بنیادی طور پر اس کے جمالیاتی ابعاد اور فنی خوبیوں کی نگاہ سے دیکھتا ہے، وہ "کنکری" میں محض ایک کہانی نہیں پاتا بلکہ متن کی روح، اس کی علامتی کائنات اور بیانیاتی جدتوں سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ افسانہ اپنی داخلی ہم آہنگی اور فنی بصیرت کے سبب قاری کو اس حد تک متاثر کرتا ہے کہ وہ اس کے ظاہری پلاٹ سے ماورا ہو کر اس کے جمالیاتی نظام میں کھو جاتا ہے۔ یہیں سے اس بات کا جواز پیدا ہوتا ہے کہ اس افسانے کا تجزیہ اس کے فنی و جمالیاتی پہلوؤں پر گہرائی سے کیا جائے، جہاں اس کی ہیئت، اسلوب اور بیانیاتی تکنیکیں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔

"کنکری" کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ مرکزی کردار؛ جو ایک شکاری ہے، رات کے ایک دھندلے اور پراسرار واقعہ (شکار میں نشانہ چوک جانے) کے ذہنی کرب میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ اس واقعے کو بھولنے کی کوشش کرتا ہے مگر یہ اس پر چھایا رہتا ہے۔ اس کی ماں اسے شکار کے جنون پر ڈانٹتی ہیں اور اس کی جسمانی کمزوری کی نشاندہی کرتی ہیں، مگر وہ آئینے میں خود کو دیکھ کر اس خیال کو رد کر دیتا ہے۔ کہانی میں اسے بار بار شکار پر جانے کا شوق ہوتا ہے، لیکن ہر بار نشانہ باندھنے کے باوجود وہ گولی چلانے میں ناکام رہتا ہے اور اسے ہر شے سے ایک گہری اکتاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ اس کے ذہن میں مولا کنجڑے اور صمد کی الاؤ کے گرد ہونے والی گفتگو گونجتی رہتی ہے، خاص طور پر مولا کا ایک منحوس جانور اور علی نامی شخص کے "گھلتے جانے" کا قصہ۔ نشانہ خطا ہو جانے پر اس جانور کا ندی میں ایک کنکری پھینکنا، جس کے گھلتے جانے سے شکاری کا وجود بھی گھلتا جاتا ہے۔ یہ قصہ مرکزی کردار کے لاشعور میں رچ بس جاتا ہے۔ افسانے کے اختتام پر، مرکزی کردار کو آئینے

میں اپنا چہرہ علی کی طرح ''گھلتا'' ہوا اور ''لمبا'' ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے، اور وہ بار بار شکار پر جانے اور خالی ہاتھ لوٹنے کے اسی دائرے میں پھنسا رہتا ہے۔ یہ کہانی حقیقت اور وہم، وجود اور فنا کے درمیان کی باریک لکیروں کو دھندلا دیتی ہے، اور اس کی یہی تہ داری اس کے پلاٹ کی غیر معمولی ساخت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کا تجزیہ ضروری ہے۔

افسانہ ''کنکری'' کا پلاٹ کسی روایتی کہانی کی طرح سیدھا اور خطی نہیں ہے بلکہ یہ غیر خطی (non-linear) اور دائرہ نما (circular) ساخت کا حامل ہے۔ یہی عدم تسلسل اس کی جمالیاتی اپیل کا بنیادی عنصر ہے، جو قاری کو ایک خاص ذہنی کیفیت سے روشناس کراتا ہے۔ پلاٹ کی یہ نوعیت واقعات کے ظاہری بہاؤ سے زیادہ کردار کی داخلی کیفیات اور نفسیاتی ردِ عمل کو اہمیت دیتی ہے۔ کہانی میں رات کا واقعہ، مولا کنجڑے کی پراسرار داستان اور کردار کا بار بار شکار پر جا کر بھی ناکام لوٹنا، یہ تمام عناصر مسلسل فلیش بیکس اور تکرار کی صورت میں کردار کے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ یہ بیانیاتی حکمتِ عملی، جس کا مقصد قاری کو ایک خواب نما اور پراسرار فضا میں لے جانا ہے، کہانی میں ایک خاص قسم کا ابہام اور گہرائی پیدا کرتی ہے۔ راحیل صدیقی نے انتظار حسین کے بیانیے کی اسی خصوصیت کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کا بیانیہ ''ہمارے اجتماعی لاشعور اور تہذیبی اقدار کا عکاس، جو ''کنکری'' کے پلاٹ کی غیر معمولی ساخت میں جھلکتا ہے۔''[4] پلاٹ کا یہ تسلسل سے عاری ہونا اور ایک ہی دائرے میں گھومتے رہنا، کردار کے وجودی کرب اور بے مقصدیت کو زیادہ مؤثر طریقے سے پیش کرتا ہے، اور اسے محض ایک واقعہ نہیں بلکہ ایک نفسیاتی حقیقت کا روپ دیتا ہے، جس سے افسانے کا اسلوبیاتی مطالعہ مزید اہمیت اختیار کرتا ہے۔

''کنکری'' میں انتظار حسین نے متعدد بیانیاتی تکنیکوں کا استعمال کیا ہے جو افسانے کی فنی عظمت میں اضافہ کرتی ہیں۔ علامت نگاری افسانے کی بنیاد ہے؛ ہر معمولی شے اور واقعہ ایک گہری علامت بن جاتا ہے۔ ''شکار'' زندگی میں مقصد کی تلاش اور اس میں ناکامی کی علامت ہے۔ ''الاو'' اور ''رہٹ کی آواز'' وقت کے تسلسل اور موت کی طرف بڑھتے سفر کی علامات ہیں۔ یہ علامتیں افسانے کو ایک عالمی اور آفاقی معنویت عطا کرتی ہیں، جو اسے محض ایک مقامی کہانی سے بلند کر دیتی ہے۔ کرداروں کی گفتگو، خاص طور پر مولا اور صمد

کی باتیں، محض روزمرہ کے دیہی جملے نہیں بلکہ ''علمیاتِ خوف'' کا ایک بیانیہ تخلیق کرتی ہیں، جیسے وہ کنکری کی نحوست کا ذکر کرتے ہوئے محض ڈر نہیں پیدا کرتے بلکہ قاری کو ایک ایسی مابعدالطبیعیاتی بے یقینی سے دوچار کر دیتے ہیں جس کا کوئی حتمی ماخذ نہیں۔ بیانیہ کی سطح پر یہ افسانہ مکمل طور پر شعور کی رو (stream of consciousness) کی تکنیک پر مبنی نہیں، لیکن تاہم اس میں شعور کی رو کے متوازی ایک ''منتقل ہوتا ہوا شعور'' (transferred consciousness) موجود ہے، جہاں کردار کے مشاہدے اور قاری کے شعور کے درمیان ایک نیم سیال سا پردہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی داخلی خود کلامی (Interior Monologue) کا استعمال بھی نمایاں ہے۔ کردار کے دخلی خیالات، اس کے منتشر اور گڈمڈ احساسات، اور ماضی کی یادیں براہ راست قاری تک پہنچتی ہیں، جو اس کی نفسیاتی پیچیدگی کو اجاگر کرتی ہے۔ جب کردار ناول پڑھتے ہوئے اپنے خیالات کے بھنور میں کھو جاتا ہے:

> وہ اب محض الفاظ کی منزل سے گزر کر محض واقعات پڑھ رہا تھا رفتہ رفتہ اس کی گرم جوشی ٹھنڈی پڑنے لگی۔ فقروں کا باہمی ربط ٹوٹنے لگا پھر لفظ فقروں کی لڑی سے بچھڑنے لگے۔ لفظ فقروں کی لڑی سے بچھڑ کر دھندلے پڑنے لگے، کھلنے لگے رات کا واقعہ اسے پھر یاد آ رہا تھا۔[5]

بیانیاتی تکنیک میں فلیش بیک (Flashback) اور تکرار (Repetition) کا استعمال بھی جمالیاتی طور پر اہم ہے۔ کہانی میں رات کا واقعہ، علی کا قصہ اور ''کھل جانے'' کا توجیہ بار بار فلیش بیک اور تکرار کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، جو کردار کے ذہن پر اس کے گہرے اور نہ مٹنے والے اثرات کو نمایاں کرتا ہے۔ یہ تکرار محض بیانیاتی ضرورت نہیں بلکہ ایک نفسیاتی گونج اور کردار کی مجبوری کا احساس بھی دلاتی ہے۔ افسانے کا ابہام (Ambiguity) بھی ایک شعوری جمالیاتی انتخاب ہے۔ مولا کے سنائے گئے قصے کی حقیقت یا کردار کے اپنے کھلتے ہوئے وجود کا تجربہ، قاری کے لیے کسی حتمی تعبیر تک پہنچنا مشکل بنا دیتا ہے۔ ولف گینگ آئزر (Wolfgang Iser) کے مطابق، یہ ابہام دراصل ''خالی جگہوں'' (Gaps) کو جنم دیتا ہے جنہیں قاری اپنی تعبیرات سے پر کرتا ہے، اور یہ خالی جگہیں قاری کو متن کے ساتھ مزید گہرا تعلق قائم کرنے پر مجبور کرتی

ہیں۔[6] ''کنکری'' میں یہ ابہام ہی اس کے معنیاتی تنوع کا سبب بنتا ہے، جس کا بیانیات کی رو سے جائزہ لینا ضروری ہو جاتا ہے۔

علم بیانیات (Narratology) کی رو سے دیکھیں تو ''کنکری'' کی ساخت اور بیانیاتی حکمتِ عملی غیر معمولی ہے۔ اس میں زیادہ تر واحد غائب راوی (Third-Person Narrator) استعمال کیا گیا ہے جو محدود معلوماتی نقطہ نظر (Limited Omniscience) رکھتا ہے، یعنی وہ صرف مرکزی کردار کے اندرونی خیالات اور احساسات تک رسائی رکھتا ہے۔ یہ راوی قاری کو براہ راست کردار کی ذہنی اور نفسیاتی دنیا میں لے جاتا ہے، جس سے اس کی تنہائی، خوف اور کرب کا احساس گہرا ہو جاتا ہے۔ اس سے قاری کا کردار کے ساتھ جذباتی تعلق مضبوط ہوتا ہے اور وہ کہانی کو اس کی داخلی دنیا کے آئینے میں دیکھتا ہے۔ زمان کا بیانیہ خطی نہیں بلکہ نفسیاتی زمان (Psychological Time) کو ترجیح دی گئی ہے، جہاں واقعات وقت کے عمومی بہاؤ کے بجائے کردار کے ذہنی ادراک کے مطابق پیش آتے ہیں۔ ماضی، حال، اور خواب آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں، جو کردار کی منتشر ذہنی حالت کی عکاسی کرتا ہے۔ مکان (setting) بھی کردار کی داخلی کیفیت کا ایک استعارہ بنتا ہے۔ ویران کھیت، الاؤ، اور رہٹ کی مسلسل آواز ایک بے رونق اور مایوسی کی فضا پیدا کرتی ہے جو کردار کے اندرونی انتشار سے ہم آہنگ ہے۔ کردار نگاری بھی داخلی اور نفسیاتی ہے۔ مرکزی کردار (شکاری) کے عمل سے زیادہ اس کی سوچیں، محسوسات اور یادیں اسے متعارف کراتی ہیں، اور وہ ایک آفاقی انسانی کرب اور وجودی بے چارگی کی علامت بنتا ہے۔ ثانوی کردار محض اس کے ذہنی عمل کے لیے محرک کا کام کرتے ہیں، جو افسانے کے جمالیاتی فوکس کو مرکزی کردار کے داخلی سفر پر مرکوز رکھتا ہے۔ یہ تمام بیانیاتی خصوصیات مل کر ''کنکری'' کو ایک ایسا فن پارہ بناتی ہیں جو محض ایک کہانی سے بڑھ کر ایک کثیر الجہت جمالیاتی تجربہ پیش کرتا ہے۔

انتظار حسین کا اسلوب ''کنکری'' میں اپنی تمام تر انفرادیت اور فنی چابک دستی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس اسلوب کی ایک خصوصیت اس کی غنایت (lyricism) ہے۔ انتظار حسین کی نثر میں ایک خاص قسم کی موسیقیت اور روانی پائی جاتی ہے جو ایک خوابیدہ اور مبہم فضا پیدا کرتی ہے۔ زبان کا انتخاب، جملوں کی

ساخت اور فضا سازی ایسی ہے کہ قاری کو ایک حسی تجربہ ہوتا ہے جہاں وہ کردار کی ذہنی کیفیت میں ڈوب جاتا ہے۔ ''کنکری'' کا اسلوب سادہ بیانیہ کے بجائے علامتی (symbolic) اور استعاراتی (metaphorical) طرزِ اظہار کا حامل ہے، جو انہیں اردو افسانے میں ایک منفرد پہچان عطا کرتا ہے۔ کہانی میں کنکری فقط ایک معمولی شے نہیں، بلکہ رفتہ رفتہ وہ ایک استعارہ بن جاتی ہے؛ گھلتی ہوئی، معدوم ہوتی، ہلکی سی آواز دیتی، جیسے ''ذات کی گہرائیوں میں کوئی انجان چیخ آہستہ آہستہ بلند ہو رہی ہو''[7]۔ اس طرح کنکری کا تاثر صرف بصری یا سمعی نہیں بلکہ ایک کثیر حسی (multisensory) تجربہ بن جاتا ہے، جو قاری کو جمالیاتی اور وجودی دونوں سطحوں پر اپیل کرتا ہے۔ ''پانی کے کٹورے میں گرتی کنکری کی آواز'' نہ صرف سمعی استعارہ ہے بلکہ ایک تاثرانگیز کیفیت بھی ہے جس کے ذریعے قاری کے لاشعور میں کوئی مدھم گونج سی پیدا ہوتی ہے۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جہاں ''جمالیاتی قاری'' فن پارے کے ساتھ یگانگت محسوس کرتا ہے، اور اس کی قرأت فقط تفہیم کا عمل نہیں رہتی، بلکہ ایک ''تجربہ'' بن جاتی ہے۔

یہاں جمالیاتی قاری کو متن میں موجود علامات اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور اس کی قرأت علامتی تجزیہ کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ یہ افسانہ اپنی فنی پیچیدگیوں اور معنیاتی گہرائیوں کے باعث ہی ایک جمالیاتی قاری کے لیے معنی کی نئی راہیں کھولتا ہے۔ اس کی جمالیاتی اپیل اس کی ہنرمندانہ ساخت، علامتی بیان اور قاری کو ایک ایسے تجربے سے دوچار کرنے کی صلاحیت میں پنہاں ہے جہاں لفظوں سے ماورا ایک گہرا کرب اور فلسفیانہ گہرائی محسوس ہوتی ہے۔ یوں ''کنکری'' کا علامتی مطالعہ صرف کہانی پڑھنا نہیں بلکہ ادبی جمالیات کا ایک مکمل تجربہ ہے جو قاری کو اپنی ذات اور کائنات کے نئے معانی دریافت کرنے پر اکساتا ہے۔

انتظار حسین کا افسانہ ''کنکری'' اپنی گہری علامتیت اور کثیر الجہت معنویت کے باعث ایک جمالیاتی قاری کے لیے فکر و نظر کی نئی راہیں کھولتا ہے تاہم جب ایک قاری اس افسانے سے علامتی ''زاویۂ قرأت'' کے ساتھ رجوع کرتا ہے، تو اس کا ''توقعات کا افق'' محض سطحی کہانی کی تفہیم سے بلند ہو کر متن میں پنہاں گہرے اور پوشیدہ معانی کی تلاش میں سرگرم ہو جاتا ہے۔ یہ قاری اس بات کی توقع کرتا ہے کہ افسانے میں موجود ہر کردار، واقعہ، اور حتیٰ کہ معمولی شے بھی اپنی ظاہری حیثیت سے بڑھ کر کسی ماورائی یا فلسفیانہ خیال

کی نمائندگی کرے گی۔اس قرأت کے دوران قاری کا مقام Implied Reader کے قریب تر آ جاتا ہے، یعنی ایسا قاری جسے متن نے خود اپنے اندر متشکل کر رکھا ہے، جو کردار کے ذہنی دھارے کے ساتھ مکمل ہم آہنگ ہو کر متن میں غوطہ زن ہوتا ہے۔ قاری جب اس کردار کی خاموشیوں، اس کے بے نام اضطراب اور غیر متعین احساسات کو پڑھتا ہے تو وہ متن کی سطری معنویت سے نیچے اتر کر اس کی نفسیاتی ساخت میں داخل ہوتا ہے۔

افسانے کا عنوان ''کنکری'' بذاتِ خود ایک مرکزی اور نہایت طاقتور علامت ہے جو انسانی وجود کی بے وقعتی، اس کے فانی ہونے اور وقت کے بے رحم دھارے میں اس کے بتدریج گھل کر مٹ جانے کی کیفیت کو نہایت بلیغ انداز میں ظاہر کرتی ہے۔یہی مرکزی علامت ''کنکری'' صرف ایک معمولی پتھر نہیں بلکہ ایک گہرے نفسیاتی اور وجودی بحران کی علامت ہے۔ قاری جب اس علامت سے روبرو ہوتا ہے، تو اس کا ذاتی تجربہ، فکری پس منظر اور ثقافتی سیاق اس علامت کے تاثر اور مفہوم کو وضع کرتا ہے۔ایک قاری جس کے لیے ''کنکری'' محض ایک آواز ہے، وہ اسے ایک صوتی تمثیل کے طور پر دیکھے گا، مگر وہ قاری جو علامتی قرأت (symbolic reading) کے لیے تیار ہے، اس کے لیے کنکری ''لا علمی کے اندھے کنویں میں گرتی شناخت'' کی علامت بھی بن سکتی ہے۔ یہی وہ قاری ہے جو ریسپشن تھیوری کے مطابق فعال کردار ادا کرتا ہے، اور ''کنکری'' کو محض صوتی یا بصری شے نہیں بلکہ ایک ذہنی اضطراب کی تجسیم سمجھتا ہے۔افسانے کا علامتی نظام نہ صرف کنکری تک محدود ہے بلکہ اس میں شامل کردار، فضا، اشیاء، اور خاموشیاں سب علامتی معنی سے مملو ہو جاتے ہیں۔ یہ محض ایک ٹھوس چیز نہیں بلکہ انسانی زندگی کی ناپائیداری، اس کی تحلیل اور فنا کی گہری تمثیل ہے۔ مرکزی کردار کا یہ احساس کہ ''وہ اب ایک مٹی کا ڈھیلا، امنڈتے ہوئے سمندر میں ایک بہتا پتہ، ایک گھلتی کنکری ہے''۔[8] قاری کو محض ایک حسی کیفیت سے نہیں گزارتا بلکہ اسے وجودی بے چارگی، زوال اور لاحاصلیت کے آفاقی احساس سے جوڑتا ہے۔ یہ علامت قاری کے ذہن میں اساطیری اور نفسیاتی تہوں کو چھوتی ہے جہاں انسان ہمیشہ اپنی بقا اور فنا کے درمیان جھولتا نظر آتا ہے۔

مرکزی کردار کی واپسی، اس کا پیچھے مڑ کر دیکھنا، اور کنکری کا نشانہ بننا ایسے اشارے ہیں جو retrospective guilt (پس دیدی احساسِ گناہ) کا مظہر بنتے ہیں۔ سگمنڈ فرائیڈ (Sigmund Freud) کے

مطابق ''ہر خواب یا علامت لاشعور کی زبان بولتی ہے۔''[9] قاری جب ان علامات کو نفسیاتی مظاہر کے طور پر پڑھتا ہے تو وہ اس کردار کی ''غیر مرئی نفسیاتی کشمکش'' کو محسوس کرتا ہے؛ وہ کشمکش جو کسی بچپن کی یا ماضی کی گناہی یاد کے ساتھ جڑی ہے۔ کنکری کا پھینکنا ایک جسمانی عمل سے زیادہ ایک symbolic discharge بنتا ہے، یعنی وہ اندرونی اضطراب یا بے اطمینانی کا خارجی اظہار۔ اسی طرح، افسانے میں مرکزی کردار کے ''شکار'' پر بار بار جانے اور نشانہ باندھ کر بھی گولی نہ چلا پانے کی تکراری ناکامی بھی ایک گہری علامتی معنی رکھتی ہے۔ یہ محض شکاری کی بزدلی یا جسمانی کمزوری نہیں بلکہ یہ جدید انسان کی مقصدیت کی تلاش میں ناکامی، بے عملی، ارادے کی کمزوری، اور زندگی کے حقیقی چیلنجز سے نبرد آزمانہ ہونے کی علامتی تصویر پیش کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا وجودی کرب ہے جہاں فرد اپنے اعمال پر کنٹرول کھو دیتا ہے اور ایک لامتناہی دائرے میں پھنسا محسوس کرتا ہے۔

افسانے کی علامتی کائنات مزید گہرائی اختیار کرتی ہے جب قاری ''گھل جانے'' کے استعارے پر غور کرتا ہے۔ یہ محض جسمانی تحلیل کی علامت نہیں بلکہ نفسیاتی انہدام، شناخت کے نقصان، اور تہذیبی زوال کی ایک پیچیدہ علامت ہے۔ مرکزی کردار کا اپنے چہرے کو آئینے میں ''گھلتا'' ہوا محسوس کرنا اور اس کا علی نامی شخص کے ''گھل کر بندر بن جانے'' کے قصے سے منسلک ہونا، قاری کے ذہن میں انسانی ماہیت، اخلاقی تنزلی، اور وجودی تبدیلی کے حوالے سے گہرے سوالات پیدا کرتا ہے۔ یہ علامت ایک ایسے اجتماعی نفسیاتی کرب کی عکاسی کرتی ہے جہاں فرد اپنی جڑوں، اپنی پہچان، اور اپنے اقدار سے بتدریج منقطع ہوتا چلا جاتا ہے، ممنوعہ عمل کر بیٹھتا ہے تو اس کا وجود ایک مبہم دھند میں تحلیل ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ کارل جنگ (Carl Jung) کے نقطہ نظر سے، ''تبدیلی'' (transformation) کی یہ آرکی ٹائپل کہانی لاشعوری سطح پر انسانی فطرت میں موجود جبلی اور اخلاقی تبدیلیوں کی علامت ہے۔[10] مزید برآں، مولا کنجڑے کی سنائی ہوئی ''علی'' کی پراسرار کہانی اور ''منحوس جانور'' بھی محض لوک کہانیاں نہیں بلکہ انسانی فطرت کی جبلی کمزوریوں، ماورائی خوف، اور وجودی خطرات کی علامتی بازگشت ہیں۔ یہ کہانی مذہبی اور اساطیری حوالوں سے بھی جڑی ہے (جیسے ہفتہ کے دن شکار پر قوم کا مسخ ہونا)، جو قاری کو اساطیری اور مذہبی علامتوں کے ذریعے انسانی اخلاقیات اور ان کے نتائج پر

غور کرنے پر اکساتی ہیں۔ افسانے میں موجود دیگر ماحولیاتی علامتیں بھی اس کی معنویت کو بڑھاتی ہیں۔ ”الاؤ“ (bonfire) کے گرد بیٹھے مولا اور صمد کی گفتگو، جو وقت کے خاموش گزرنے کی گواہی ہے، ماضی کی یادوں، روایتی دانش اور معدوم ہوتی ثقافت کی علامت بن جاتی ہے۔ ”رہٹ کی آواز“ جو مسلسل سنائی دیتی ہے، زندگی کے لامتناہی چکر، وقت کے تسلسل، اور کسی غیر مرئی نظام کے چلتے رہنے کی علامتی یاد دہانی ہے۔ یہ علامات مل کر افسانے میں ایک مابعد الطبیعاتی فضا پیدا کرتی ہیں جو قاری کو صرف کہانی سے نہیں بلکہ ایک گہرے فلسفیانہ اور روحانی تجربے سے روشناس کراتی ہے۔ انتظار حسین کا یہ علامتی اسلوب قاری کو متن کی گہرائیوں میں اترنے پر مجبور کرتا ہے اور اسے معانی کے کثیر الجہت دروازے کھول کر ایک ایسے تخلیقی عمل میں شریک کرتا ہے جہاں ہر قاری اپنے ”توقعات کے افق“ اور ”زاویہ قرأت“ کے ساتھ متن سے نئے معانی اخذ کرتا ہے۔

انتظار حسین کا افسانہ ”کنکری“ اپنی گہرائی اور ماورائی اشاروں کے سبب مابعد الطبیعاتی تناظر سے تجزیے کے لیے ایک بھرپور متن ہے۔ ایک قاری جس کا ”زاویہ قرأت“ وجود کے بنیادی سوالات، حقیقت کی نوعیت، اور انسانی تقدیر کے فلسفیانہ مباحث پر مرکوز ہو، وہ ”کنکری“ کو محض ایک کہانی کے بجائے ایک فلسفیانہ تفکر کے طور پر پڑھے گا۔ ایسے قاری کا ”توقعات کا افق“ اس بات کی توقع کرے گا کہ افسانہ زندگی، موت، حقیقت اور وہم کے درمیان کی سرحدوں کو دھندلا کر ماورائی مفاہیم کی طرف اشارہ کرے گا۔ افسانے میں حقیقت اور خواب کے مابین دھندلی سرحدیں مابعد الطبیعاتی ابہام کا بنیادی ستون ہیں۔ کردار کا رات کے واقعے کو خواب سمجھ کر بھلانے کی کوشش کرنا، مگر اس کا حقیقت کی طرح بار بار لوٹ کر آنا، یہ ظاہر کرتا ہے کہ حقیقی اور غیر حقیقی کی تمیز مٹ چکی ہے۔ یہ کیفیت قاری کو اس سوال کی طرف لے جاتی ہے کہ آیا وہ حقیقت جسے ہم اپنی حواس سے پرکھتے ہیں، وہ واحد اور مطلق حقیقت ہے، یا اس کے پردے میں کوئی اور ماورائی حقیقت بھی کارفرما ہے؟ یہ فکری رویہ وجودیت کے اس تصور سے ہم آہنگ ہے جہاں انسانی وجود کو بے معنی اور غیر یقینی قرار دیا جاتا ہے۔ البرٹ کامیو (Albert Camus) کے بقول:

> انسان کو ایک ایسی کائنات میں پھینک دیا گیا ہے جہاں کوئی ماورائی معنی موجود

نہیں، اور اس کا وجود لامتناہی بے سمتی کا شکار ہے۔[11]

"کنکری" کا مرکزی کردار اسی وجودی بے مقصدیت اور لاحاصلی کا عکاس ہے۔ اس کا بار بار شکار پر جانا اور ہر بار گولی نہ چلا پانا، محض ایک ناکامی نہیں بلکہ زندگی کے بنیادی سوالات کا کوئی شافی جواب نہ ملنے کی مابعد الطبیعاتی تمثیل ہے۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ انسان ایک ایسے مقصد کی تلاش میں سرگرداں ہے جس کا کوئی حصول نہیں، اور اس کی جدوجہد بالآخر بے معنی ثابت ہوتی ہے۔ یہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ انسان اپنے وجود کی مطلق آزادی کے باوجود، اپنے اعمال کا حقیقی مالک نہیں، اور کسی ماورائی قوت کے تحت بے بس ہے۔

افسانے میں "گھل جانے" (dissolving/melting) کا مرکزی استعارہ، مابعد الطبیعاتی سطح پر انسانی وجود کے فانی ہونے اور اس کے عدم (nothingness) کی طرف سفر کی علامت ہے۔ یہ صرف جسمانی تحلیل نہیں بلکہ روح اور ذات کا مٹ جانا ہے، جو فنا فی الوجود کے فلسفے سے جڑتا ہے۔ جب کردار آئینے میں اپنے چہرے کو "گھلتا" اور "لمبا" ہوتا ہوا دیکھتا ہے جیسے مولا کنجڑے کی کہانی کا علی تو یہ صرف نفسیاتی بحران نہیں بلکہ وجود کے مابعد الطبیعاتی زوال کی انتہائی تصویر ہے۔ یہ قاری کو اس گہرے سوال کی طرف لے جاتا ہے کہ انسان کی حقیقی ماہیت کیا ہے، اور کیا جسم کے ساتھ ساتھ اس کا باطن بھی تحلیل ہو سکتا ہے؟ یہ صوفیانہ افکار میں موجود فنا کے تصور سے بھی ہم آہنگ ہو سکتا ہے جہاں ذات کا فنا ہو جانا روحانی مدارج کی ایک شکل ہے۔ مولا کنجڑے کی سنائی ہوئی علی کی کہانی اور اس کا "بندر" بن جانا، مابعد الطبیعاتی تناظر میں انسانی تنزلی، اخلاقی انحطاط، اور روح کی پستی کی ایک خوفناک تمثیل ہے۔ یہ محض ایک قصہ نہیں بلکہ انسان کے جبلی رجحانات اور روحانی پستی کا مابعد الطبیعاتی اظہار ہے، جو انسان کو اس کی حیوانی جبلتوں کے سامنے بے بس دکھاتا ہے۔ یہ سوال اٹھاتا ہے کہ انسان کی روحانی حیثیت کیا ہے اور کیا وہ اپنی فطرت سے انحراف کے بعد اپنی انسانیت سے بھی محروم ہو سکتا ہے؟ افسانے میں زمان (time) کا غیر خطی اور دائرہ نما بہاؤ بھی مابعد الطبیعاتی نوعیت کا حامل ہے۔ ماضی، حال، اور خوابوں کا آپس میں مدغم ہو جانا، ایک ایسی حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے جہاں زمان و مکاں کی ظاہری حدود بے معنی ہو جاتی ہیں، اور قاری کو ایک ابدی، غیر مادی

حقیقت کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ یہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کردار وقت کی گرفت سے آزاد ہو کر ایک ایسے دائرے میں پھنسا ہے جہاں نہ آغاز ہے نہ انجام، اور یہ لامتناہی پن انسانی تقدیر کی بے چارگی کا مابعد الطبیعاتی استعارہ ہے۔ ایک مابعد الطبیعاتی قاری کے لیے "کنکری" محض ایک کہانی نہیں بلکہ انسانی وجود کی پراسراریت، اس کی کم مائیگی، اس کی فنا پذیری، اور اس کے ازلی خوف پر ایک گہرا فلسفیانہ مراقبہ ہے جو قاری کو کائنات اور اپنی ذات کی ماہیت پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

انتظار حسین کا افسانہ "کنکری" اپنے اندر مضمر ابہام اور کثیر المعنویت سبب مابعد نوآبادیاتی تناظر سے تجزیے کے لیے ایک انتہائی اہم متن ہے۔ جب ایک قاری اس افسانے کا مطالعہ مابعد نوآبادیاتی "زاویۂ قرأت" کے ساتھ کرتا ہے، تو اس کا "توقعات کا افق" صرف انفرادی نفسیات یا وجودی کرب تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ برصغیر کی تقسیم کے بعد پیدا ہونے والے گہرے شناختی بحرانوں، تہذیبی کشمکش، نوآبادیاتی وراثت کے اثرات، اور بے گھری کے اجتماعی تجربات کو متن میں تلاش کرنے لگتا ہے۔ اس قاری کی توقع یہ ہوتی ہے کہ افسانہ براہ راست سیاسی بیانیہ نہ ہونے کے باوجود، نوآبادیاتی دور کے خاتمے اور نئی ریاستوں کے قیام کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سماجی اور نفسیاتی دھچکوں اور شناختی بحران کی عکاسی کرے گا۔ انتظار حسین کے افسانے محض ذاتی یا جذباتی کیفیات کا اظہار یہ نہیں، بلکہ مابعد نوآبادیاتی ذہن کی تہہ در تہہ شکست و ریخت کا عکاس ہیں۔ "کنکری" کی کہانی کسی قصبے، مقام یا شخص کی واپسی کی داستان سے بڑھ کر ایک ایسی رمز بن جاتی ہے جس میں تاریخ کی کراہیں، ہجرت کے صدمے، اور شناخت کے بحران موجود ہیں۔ ایڈورڈ سعید (Edward Said) کے مطابق:

> Texts are worldly; they are part of the world, they are a product and producer of social and political realities.[12]

یہی اصول "کنکری" پر بھی لاگو ہوتا ہے، جہاں قاری متن کو نہ صرف ایک جمالیاتی تجربے کے طور پر دیکھتا ہے، بلکہ اس میں نوآبادیاتی زخموں اور طاقت کے تفاعل کو بھی شناخت کرتا ہے۔ افسانے کے مرکزی کردار کا وجودی زوال اور اس کا "گھل جانا" (dissolving/melting) کا احساس، اس تناظر میں صرف

انفرادی نفسیاتی حالت نہیں بلکہ تقسیمِ ہند کے بعد کی قوموں اور تہذیبوں کی اجتماعی تحلیل، ثقافتی تذبذب اور قومی شناخت کے التباس کی ایک گہری استعاراتی نمائندگی ہے۔ نوآبادیاتی طاقتوں کے جانے کے بعد، برصغیر کے باسی ایک نئی، نامعلوم دنیا میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرنے لگے، جہاں ان کی قدیم اقدار اور طرزِ زندگی بتدریج ختم ہو رہے تھے اور ایک نئی، مگر غیر واضح، شناخت کی تلاش جاری تھی۔

''کنکری'' کا شکاری دراصل اسی نوآبادیاتی پسماندگی اور مابعد نوآبادیاتی بے عملی کی تصویر ہے، جو ایک عظیم تاریخی تبدیلی کے بعد اپنے مقصد، اپنی طاقت اور اپنے ماضی سے کٹ کر رہ گیا ہے۔ اس کی شکار میں بار بار کی ناکامی، کسی بھی فیصلہ کن عمل سے گریز اور اس کی بے سمتی، اس نوآبادیاتی دور کے بعد کی نسل کی بے راہ روی، بے عملی اور ایک واضح سمت کے فقدان کی علامت بن جاتی ہے، جو اپنی روایات اور عصری تقاضوں کے بیچ ایک عجیب و غریب کشمکش کا شکار ہے۔ یہ صورتِ حال اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ نوآبادیاتی تسلط نے مقامی آبادی کے اعتماد کو اس قدر مجروح کیا کہ وہ اپنے مقاصد کے حصول میں بھی ناکام ہو گئے۔

مابعد نوآبادیاتی تناظر میں افسانے میں ماضی کی یادوں کا مسلسل حملہ اور مولا کنجڑے کی علی والی کہانی محض انفرادی نفسیاتی الجھنیں نہیں بلکہ یہ نوآبادیاتی تاریخ کے نہ ختم ہونے والے اثرات اور تقسیم کے گہرے صدمے کی بازگشت ہیں۔ یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح نوآبادیاتی ماضی، جو بظاہر ختم ہو چکا ہے، آج بھی اجتماعی لاشعور اور ثقافتی نفسیات پر حکمرانی کر رہا ہے۔ مولا کنجڑے کی کہانی میں علی کا ''گھل کر بندر بن جانا'' مابعد نوآبادیاتی قاری کے لیے ایک گہری اور خوفناک علامت ہے۔ یہ نوآبادیاتی تجربے کے تحت ہونے والی انسانیت کی پامالی اور تہذیبی انحطاط کی نشاندہی کر سکتا ہے، جہاں نوآبادیاتی طاقتوں نے مقامی آبادی کو ''غیر'' (the Other) اور ''کمتر'' (inferior) بنا کر پیش کیا، جس سے ان کی اپنی انسانیت اور تہذیبی وقار مجروح ہوا۔ یہ علامت نوآبادیاتی نظریے کے تحت ثقافتی تنزلی اور روایتی اقدار کے مسخ ہونے کو بھی ظاہر کرتی ہے، جس سے مقامی لوگ اپنی اصل شناخت کھو کر ایک نئی، غیر مکمل اور مسخ شدہ شکل اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ہومی کے بھابھا (Homi K. Bhabha) کے نظریات، جو ہائبرڈٹی (hybridity) اور مماثلت

(mimicry) پر زور دیتے ہیں،اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ کس طرح نوآبادیاتی اثرات کے تحت مقامی ثقافتیں اپنی اصلیت سے ہٹ کر ایک ملی جلی اور مبہم شناخت اختیار کرتی ہیں،جو ''گھلنے'' کے تصور سے گہرا ربط رکھتی ہے۔[13] افسانے میں روایتی داستان گوئی (الاو کے گرد) کا عنصر بھی اہم ہے۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ نوآبادیاتی دور میں زبانی روایت اور مقامی قصے کس طرح مزاحمت اور اپنی شناخت کے تحفظ کا ذریعہ بنے۔ یہاں قاری کی یہ پوزیشن دراصل critical reader کی ہے،جو مابعد نوآبادیاتی مظاہر کو متنی ساخت کے اندر شناخت کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ متن نہ تو محض تخیل ہے،نہ ہی فقط انفرادی اظہار؛ بلکہ ایک وسیع تر تاریخی اور سیاسی شعور کا حصہ ہے۔ انتظار حسین کے افسانے اپنی رمزیت اور ابہام کے باوجود اپنے قاری کو اس مقام پر لے آتے ہیں جہاں قاری محض قاری نہیں رہتا، بلکہ *interpreter of silence* بن جاتا ہے،اور ہر خاموشی میں طاقت کی گونج سنتا ہے۔ یہی قاری اساس تنقید کی غایت بھی ہے کہ وہ متن کے ''نہ کہے گئے'' کو بھی ''پڑھ'' سکے۔ مابعد نوآبادیاتی زاویے کے حامل قاری کے لیے ''کنکری'' محض ایک کہانی نہیں بلکہ نوآبادیاتی دور کے بعد کی نسلوں کے کرب، شناخت کی تلاش اور ایک تہذیب کے اجتماعی المیے کی ایک طاقتور ادبی دستاویز ہے، جو اپنی علامتی گہرائی کے ذریعے ایک وسیع تاریخی اور ثقافتی تناظر میں قاری کو دعوتِ غور و فکر دیتی ہے۔

قاری اساس تنقید کے متنوع تناظرات کی روشنی میں انتظار حسین کے افسانے ''کنکری'' کا تجزیہ اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ یہ متن صرف ایک بیانیہ یا جمالیاتی فن پارہ نہیں بلکہ معانی کی ایک متحرک کائنات ہے، جو ہر قاری کے فکری، نفسیاتی، سیاسی اور تہذیبی تناظر میں مختلف سطحوں پر منکشف ہوتی ہے۔ قاری جب اس متن سے مختلف قرأتی پوزیشنز (Reading Positions) یا توقعات کے آفاق (Horizons of Expectations) کے ساتھ مکالمہ کرتا ہے تو وہ نہ صرف اس کے ابہام، علامت اور استعارے کی پرتیں کھولتا ہے بلکہ خود بھی ایک فعال، معنی ساز شریک بن جاتا ہے۔ ایک جمالیاتی قاری کے لیے یہ افسانہ اس کی اسلوبی خوبیوں، استعاراتی بنت اور بیانیاتی تنظیم کی بنیاد پر ایک نفیس ادبی تجربہ ہے، جو روایت کے سائے میں لکھا گیا ہے مگر اپنی تکنیک میں جدید تر بھی ہے۔ دوسری طرف، علامتی اور نفسیاتی قاری اسے ایک ایسی باطنی

کائنات کے طور پر دیکھتا ہے، جہاں کنکری محض ایک پتھر نہیں بلکہ "یادداشت کا منجمد استعارہ" بن جاتی ہے، جو ماضی، شناخت اور ذات کی تشکیل کے التباس آمیز عمل کو مجسم کرتی ہے۔ سیاسی اور مابعد نوآبادیاتی قاری اس افسانے کو تاریخی جبر، اجتماعی بے دخلی اور شناخت کی شکست و ریخت کے متون کے تناظر میں دیکھتا ہے؛ اور یہ قاری وہ صدائیں سن پاتا ہے جو استعارے اور علامت کی سطح پر مزاحمت کے استعارے بن چکی ہیں۔ قاری کی توقعات کا افق یہاں تاریخ، طاقت، مذہب اور شناخت کی گھمبیر سیاست سے مشروط ہوتا ہے، جو متنی فضا کو ذاتی سے بڑھا کر اجتماعی اور تہذیبی سطح پر لے آتا ہے۔ افسانے کا متنی تناظر قاری کو خود اس کے ثقافتی شعور سے جوڑتا ہے، یوں وہ متن کو کسی جامد حقیقت کے بجائے متحرک، سیال اور تنقیدی سطح پر دریافت کرتا ہے۔

اس ہمہ گیر قاری اساس تجزیے سے جو سب سے اہم نتیجہ اخذ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ "کنکری" کی معنویت کسی ایک قاری، تنقیدی پوزیشن یا سیاق پر منحصر نہیں۔ اس کی کثیر المعنویت ہی اس کی سب سے بڑی تخلیقی خوبی ہے، اور یہی وہ نکتہ ہے جو ہانس رابرٹ جاس، ولف گینگ آئزر اور رولاں بارتھ ایسے جیسے مفکرین کے نظریات کو ایک سطح پر ہم آہنگ کرتا ہے کہ "متن ہمیشہ مکمل نہیں ہوتا، قاری ہی اسے مکمل کرتا ہے"۔ "کنکری" کا قاری اساس تجزیہ اس امر کا عملی مظہر بن جاتا ہے کہ قاری کا شعور، اس کی روایت، نظریہ، نفسی کیفیت اور فکری پس منظر نہ صرف متن کی قرأت کی نوعیت کا تعین کرتا ہے بلکہ خود بھی متنی تفاعل کا حصہ بن جاتا ہے۔ یہی قاری اساس تنقید کی جمالیات اور افادیت ہے۔

حوالہ جات

1. Northrop Frye, *The Well-Tempered Critic* (Bloomington: Indiana University Press, 1963), 137.
2. Stanley Fish, *Is There a Text in This Class? The Authority of Interpretive Communities* (Cambridge: Harvard University Press, 1980), 13.
3. Wolfgang Iser, *The Act of Reading: A Theory of Aesthetic Response,* (Baltimore: Johns Hopkins University Press, 1978), 51.
4. رحیل صدیقی، اردو بیانیہ اور انتظار حسین (حیدر آباد: رعنا پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء)، ۴۵۔
5. انتظار حسین، کنکری (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء)، ۲۱۴۔

6. Wolfgang Iser, *The Act of Reading: A Theory of Aesthetic Response*, 72.

7. انتظار حسین،کنکری،۲۱۹۔

8. ایضاً۔

9. Sigmund Freud, *The Interpretation of Dreams*, trans: James Strachey (New York: Basic Books, 2010), 91.

10. Karl Jung, *Man and His Symbols* (New York: Doubleday Anchor Publishers, 1964), 67.

11. Camus, Albert. *The Myth of Sisyphus*. Trans: Justin O'Brien (New York: Alfred A. Knopf, 1942), 37.

12. Edward Said, *The World, the Text, and the Critic* (Cambridge, MA: Harvard University Press, 1983), 112.

13. Bhabha, Homi K. *The Location of Culture* (London: Routledge, 1994), 44.

کتابیات:

Bhabha, Homi K. *The Location of Culture*. London: Routledge, 1994.

Camus, Albert. *The Myth of Sisyphus*. Translated by Justin O'Brien. New York: Alfred A. Knopf, 1942.

Fish, Stanley. Is There a Text in This Class? The Authority of Interpretive Communities. Cambridge: Harvard University Press, 1980.

Freud, Sigmund. *The Interpretation of Dreams*. Translated by James Strachey. New York: Basic Books, 2010. Originally published 1900.

Frye, Northrop. *The Well-Tempered Critic*. Bloomington: Indiana University Press, 1963.

Husain, Intizar. *Kankri*. Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1987.

Iser, Wolfgang. *The Act of Reading: A Theory of Aesthetic Response*. Baltimore: Johns Hopkins University Press, 1978.

Jung, Carl. *Man and His Symbols*. New York: Doubleday, 1964.

Said, Edward. *The World, the Text, and the Critic*. Cambridge, MA: Harvard University Press, 1983.

Siddiqi, Raheel. *Urdu Bayania aur Intizar Husain*. Hyderabad: Rana Publications, 2011.